ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اور وفیات نویسی

محمد سہیل شفیق ☆

Abstract

Monthly Mu'arif Azamgarh and Historical Necrology

Historical necrology is a list of deaths with dates and, generally, brief accounts of the lives of those who have departed. Recording obituaries has also had a long history, known as Vafiyaat (obituaries), the oldest book in Arabic recording the dates of death with brief accounts of lives is said to be the one compiled by Yaqoob bin Sufyan, which dates back to the year 890 AD.

In Urdu, Syed Sulaiman Nadvi (1884-1953) began writing obituaries specifically under the title 'Vafiyaat'. It began in 1914 with the death of his beloved teacher and mentor Allam Shibli Naumani. Nadvi sahib wrote about Shibli in several issues of Zamindar (Lahore) first. Then, when Ma'arif was launched in 1916, he wrote about Shibli in it. Afterwards, every issue of Ma'arif contained an editorial note, condoling the death of scholars, writers, poets and other important personalities.

☆ ڈاکٹر حافظ محمد سہیل شفیق، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

Ultimately, the obituary note in Ma'arif was titled 'Vafiyaat'. So in a way, Syed Sulaiman Nadvi was the pioneer of obituary writing in Urdu journalism.

In Ma'arif, sometimes, these obituaries were penned by other scholars working as editorial staff. Especially after Nadvi sahib's migration to Pakistan and his death in 1953, scholars such as Shah Moinuddin Nadvi, Abdus Salam Qidvai, Sabahuddin Abdur Rahman and Ziauddin Islahi wrote obituaries during different phases of Ma'arif. Umair-us-Siddiq Nadvi is the current editor of Ma'arif and pens the editorial notes.

An important aspect of these obituaries is that they are not limited to Muslims alone or writers only. It includes different nationalities and religion and there are among them writers, politicians, scientists, sufis, poets, orators, ulema and others. In a way, it is an encyclopaedic account of some important historical, political and literary events and these are not formal obituary notes but some of them are truly research articles.In the present article, I have discussed in detail Ma'arif's obituary writings.

Key words: *Monthly Mu'arif, Shibli Nomani, Historical Necrology.*

تاریخ کا ایک ماخذ تذکرۂ رفتگاں یا وفیات نگاری بھی ہے۔اسلامی عہد کے ادب میں وفیات نگاری کی روایت عربی زبان میں شروع ہوئی اور اس نے دوسری زبانوں فارسی، ترکی اور اردو ادب میں وفیات نگاری کو بھی متاثر کیا۔اس موضوع پر قدیم ترین کتاب یعقوب بن سفیان السفوی (م۲۷۷ھ/۸۹۰ء) کی ہے جس کا نامکمل نسخہ دستیاب ہے۔ان کے دو معاصرین احمد بن شعیب النسائی (۳۰۳ھ/۱۶۔۹۱۵ء) اور ابو یعلی الموصلی (م۳۰۷ھ/۹۱۹ء) کی دفیات پر تصنیف شدہ کتابیں بدقسمتی سے ضائع ہو چکی ہیں۔ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز البغوی (۲۱۳۔۳۱۷ھ/۸۲۸۔۹۲۹ء) کی وفیات الشیوخ (مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۸۲ء) اپنے موضوع پر دستیاب پہلی مفصل کتاب ہے۔(۱)

وفیات کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں سب سے زیادہ شہرت جس کتاب کو حاصل ہوئی وہ ابوالعباس شمس الدین احمد المعروف ابن خلکان (م۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء) کی وفیات الاعیان وانباء الزمان ہے۔ابن خلکان نے اس کتاب میں مختلف طبقات الناس، علماء، شعراء اور وزراء کے حالات جمع کیے۔اس کے علاوہ وفیات پر دیگر معروف کتابوں میں شمس الدین

ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان ذہبی (م ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) کی تاریخ الاسلام و وفیات المشاہیر والاعلام اور علامہ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ معروف ہیں۔ البدایہ والنہایہ اگرچہ تاریخ عالم کے واقعات پر سنین وار لکھی گئی ہے لیکن سال بہ سال وفات پانے والے مشاہیر کا ذکر بھی ہے۔ عربی زبان میں تاریخ نویسی کے ذیل میں، اور پھر مطالعاتِ رجال کے تحت ''وفیات'' نے ایک بنیادی موضوع کی حیثیت حاصل کی۔ (۲)

اردو زبان میں وفیات کے ضمن میں برصغیر پاک و ہند کے تعلق سے بے حد اہم، مفید، اور مبسوط کام ابونصر خالدی (م ۱۹۸۵ء) کا ہے جسے انہوں نے وفیات اعیان الھند کے نام سے مرتب کیا، جو شاہ ولی اللہ انسٹیٹیوٹ دہلی کے اہتمام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ یہ عہد وسطیٰ کے سلاطین و امراء اور صوفیاء و مشائخ کی تاریخ ہائے وفات پر مشتمل ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مولف نے بالعموم اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے۔ ابونصر خالدی کا ایک اور اہم کام قاموس الوفیات الاعیان الاسلام بھی ہے جو اصلاً ابوعبداللہ محمد بن سعد کاتب الواقدی کی الطبقات الکبیر اور ابوعبداللہ یاقوت الروی کی ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب سے ماخوذ ہیں۔ (۳)

اردو میں وفیات نویسی پر ایک تازہ ترین اور اہم کام ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کا ''وفیات ناموران پاکستان'' (اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء) ہے۔ اس میں ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱/دسمبر ۲۰۰۴ء کے دوران وفات پا جانے والی تقریباً دس ہزار اہم پاکستانی شخصیات کا مختصر تعارف اور مستند تاریخ وفات دی گئی ہیں۔

پاک و ہند کے جرائد نے بھی وفیات نگاری کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ جیسے الرشید (ساہیوال)، تھذیب الاخلاق (لاہور)، معارف (اعظم گڑھ)، الحق (اکوڑہ خٹک)، اردو بک ریویو (دہلی)۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب میں تاریخ، تذکرہ قطعات تاریخ اور الواح قبور / کتبات قبور پر کتب کے علاوہ ایک اور صنف بھی وفیات سے متعلق موجود ہے اور وہ اپنے دوستوں اور معاصرین کی یاد میں لکھے جانے والے یاد نامے ہیں، جیسے علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء) کی کتاب یادِ رفتگان جو ایسے وفات یافتگان کا تذکرہ ہے جن کے تعزیتی شذرے سید صاحب نے ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۴ء [۱۹۱۶ء] تا ۱۹۵۳ء لکھے تھے۔ (۴)

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی (م ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) نے معاصرین اور رشتہ داروں کی وفات پر جو تعزیتی شذرے لکھے انہیں عبدالقوی دریابادی نے وفیات ماجدی یا نثری مرثیے (شائع کردہ: مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۸ء) کے نام سے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مطابق:

> ''اردو زبان میں وفیات کی روایت کو بالعموم صحافت نے اور اس کے ذیل میں ''وفیات'' پر شذرات کے اہتمام نے فروغ دیا ہے۔ مغربی دنیا کے بعض نامور اخبارات، جریدوں اور تحقیقی مجلات میں *Obituary* کے عنوان سے ''وفیات'' کی جو ایک روایت موجود رہی ہے، اردو کی علمی صحافت نے بھی دراصل اس کا اتباع کیا ہے اور بالخصوص

معارف (اعظم گڑھ) نے، یا یوں کہیے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس روایت کو مقبول کرانے میں سب سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔(۵)

دارالمصنفین کا قیام علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی دیرینہ خواہش تھی۔ وہ ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جس کے ارکان کا کام یورپ کی اکیڈیمیوں کی طرح صرف مطالعہ اور تصنیف و تالیف ہو۔ اس کا منصوبہ پہلی بار ۱۱رفروری ۱۹۱۴ء کو مولانا ابوالکلام کے رسالے الھلال میں شائع ہوا۔ جس کے بارے میں خود مولانا ابوالکلام کا یہ کہنا تھا کہ اگر یہ منصوبہ قابل اطمینان صورت اختیار کر لے تو وہ اپنا ذاتی کتب خانہ دارالمصنفین کو وقف کرنے کے لیے تیار ہیں۔(۶)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے۔ علامہ شبلی دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ معارف نام کے ایک ماہوار علمی و دینی رسالے کا تخیل بھی رکھتے تھے۔(۷) علامہ شبلی کے رفقاء اور شاگردوں نے ان کے انتقال (۱۹۱۴ء) پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تمام تحریکوں اور منصوبوں کو وہ زندہ رکھیں گے۔

ماہنامہ معارف کے متعدد امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ ارباب علم و فضل، علماء، ادباء، شعراء، اور مختلف سیاسی و سماجی شخصیات کے انتقال پر معارف نے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بالخصوص مدیران معارف سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی، عبدالسلام قدوائی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے سینکڑوں ارباب ذکر و فکر کے احوال زندگی، معاشرتی و سماجی خدمات، علمی و ادبی فتوحات اور ذاتی اوصاف و کمالات کو قلمبند کیا۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ تین چار صفحات میں مدیر معارف بہت کچھ پیش کر دیا کرتے تھے اور علمی دنیا کے لیے معارف کے یہ صفحات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے اور اس کی ترتیب کے لیے بڑی تلاش و تفحص سے گزرنا پڑتا تھا۔''(۸)

علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) شبلی نعمانی کی رحلت کے بعد پونا کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے آئے، اور مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔(۹) اس کے بعد ایک علمی، دینی و تحقیقی ماہنامہ (معارف) کے اجراء کے لئے مراحل طے کئے گئے اور ۱۹۱۶ء میں پریس قائم کر کے علامہ شبلی نعمانی کی خواہش کے مطابق دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف جاری کیا۔(۱۰) سید صاحب کی مسلسل محنت اور کوششوں نے دارالمصنفین کو ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک موقر علمی و تصنیفی ادارہ بنا دیا جس نے مسلمانوں کی علمی و فکری اور سیاسی تاریخ کی تدوین کے ساتھ تاریخ نویسی کا بلند معیار بھی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

معارف اعظم گڑھ کا پہلا شمارہ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ (مطابق جولائی ۱۹۱۶ء) میں سید صاحب کی ادارت میں نکلا۔ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۹ء تک معارف کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۶ء میں سید صاحب نے نواب حمیداللہ خان والئی بھوپال کی دعوت پر بھوپال کے دارالقضاء اور عربی مدارس کی سربراہی قبول فرمائی جہاں آپ چار برس تک رہے، اس زمانے

میں بھی دارالمصنفین اور معارف سے آپ کا قلبی و علمی تعلق باقی رہا اور اس کی نظامت بھی آپ کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۴۹ء میں سید صاحب پاکستان آگئے۔ اگر چہ حالات نے ان کو دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، وہ اس کی فلاح کی فکر سے کبھی بے تعلق نہیں ہوئے، اس کی ہر خلش پر بے چین ہو جاتے تھے، اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے، خطوط میں برابر اس کے حالات پوچھتے، اور مفید علمی مشورے دیتے، غرض جسمانی اور قانونی طور سے جدا ہونے کے باوجود بھی ان کی روح دارالمصنفین سے وابستہ رہی۔ (۱۱) ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء میں ۶۹ سال کی عمر میں کراچی میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱۲)

سید صاحب کے شذرات نہایت اہم ہوتے تھے۔ عموماً مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہارِ خیال کرتے تھے، اہلِ علم و فضل کے انتقال پر ماتم کے لیے بھی یہ صفحات مخصوص تھے، اس لیے ان کے شذرات، مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۱۳)

معارف میں وفیات پر پہلا مضمون علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں معارف کے دوسرے شمارے میں سید سلیمان ندوی کے درجِ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوا:

> ''اکثر حضرات ہم سے علامہ مرحوم کے حالاتِ زندگی کے طالب ہیں، بہار اسٹوڈنٹس کانفرنس نے علامہ مرحوم پر سب سے بہتر مضمون نگار کے لیے انعام مقرر کیا، سوانح و حالات کے لیے اکثر اشخاص کے خطوط آتے ہیں، مطول لائف تو جب لکھی جائے گی، اس وقت اس مختصر رسالہ پر قناعت کرتے ہیں کہ منتظر احباب کو زحمت انتظار سے کسی قدر نجات مل سکے، اس مضمون سے پنجاب کے ان بعض اخبارات کی تحریروں کی تصحیح بھی ہو جائے گی، جو حادثۂ وفات کی تقریب نے مولانائے مرحوم کے سوانح زندگی کے متعلق انھوں نے لکھی تھیں۔'' (۱۴)

معارف میں ابتداً وفیات کے لیے کوئی صفحہ مخصوص نہ تھا۔ عموماً اہل علم کی وفات کا تذکرہ شذرات میں ہی کر دیا جاتا تھا۔ یہ تذکرہ اس تسلسل سے ہونے لگا کہ خود سید سلیمان ندوی ایک موقع پر لکھتے ہیں:

> ''چند مہینوں سے معارف کا پہلا صفحہ علم و فن کے بزرگوں پر ماتم کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ آج ہم دوسروں پر ماتم کرتے ہیں، کل دوسرے ہمارا ماتم کریں گے۔ دنیا کی یہ بزمِ ماتم کائنات فانی کے وجود کے ساتھ قائم ہے، اور اسی کے ساتھ قائم رہے گی۔ (۱۵)

رسائل کی دنیا میں معارف کے بہت سے اولیات ہیں جن میں سے ایک رسالہ کے مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنا ہے۔ مثلاً شذرات، مقالات، تقریظ و انتقاد، آثار علمیہ ادبیہ، تراجم، مسائل و فتاویٰ، تلخیص و تبصرہ، ادبیات اور مطبوعات۔ جون ۱۹۴۳ء سے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے مشورہ سے ان ابواب میں 'وفیات' کے عنوان کا اضافہ کیا گیا۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ بعض اوقات کسی عالم کی موت کا ذکر اپنے سحر بھرے الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ بھی ہو جاتی ہیں، اگر آپ مستند یورپی رسائل کی طرح ایک الگ موضوع وفات بنالیں تو اچھا ہے۔'' (۱۶)

چنانچہ 'وفیات' کے عنوان کے تحت پہلی تعزیتی تحریر شمس العلماء عبدالرحمٰن شاطرؔ مرحوم پر جون ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

قیام بھوپال (جون ۱۹۴۶ء تا اکتوبر ۱۹۴۹ء) کے دوران سید صاحب معارف کے لیے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے اساتذہ وشیوخ، احباب، معاصرین اور دوسرے ارباب کمال کی وفات پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہوگیا تھا۔ یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے۔ سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت حاصل تھی اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے، کس حسنِ ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کی زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح حیات کو سید صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلمبند کرتے رہے ہوں، اور وقت آنے پر ان کو معارف میں نقل کردیتے ہوں۔ (۱۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پائے اور ان کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصے میں آئے۔'' (۱۸)

سید صاحب کو بھی ان تحریروں کی تاریخی نوعیت کا بخوبی احساس تھا چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

''اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی تاریخ وفات کی تعیین ہے۔ تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔'' (۱۹)

سید سلیمان ندوی نے معارف میں سو سے زائد وفیات قلمبند کیں۔ سید سلیمان ندوی کی تعزیتی تحریریں اپنی جگہ ادبی شہ پارے ہیں، خیالات کی روانی اور الفاظ کی بندش ایک سماں باندھ دیتی ہے۔ مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ محمد اقبال، سید محمد سلیمان اشرف پر ان کی تعزیتی تحریریں مثال کے طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا حمیدالدین فراہی کے انتقال پر لکھتے ہیں:

''الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر وشام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی، حق یہ ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر وشام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا، وہ جس کے فضل وکمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی ومغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی، عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد وورع کی تصویر، فضل وکمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوقِ عکاظ، ایک شخصیت مفرد،

لیکن ایک جہانِ دانش، ایک دنیائے معرفت! ایک کائنات علم! ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بینوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردوقبول اور عالم کے داو وتحسین سے بے پروا، گوشہ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس وتعلیم میں محو، ہر شے سے بے گانہ، اور ہر شغل سے نا آشنا تھی، افسوس کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہوسکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے سمجھنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں۔۔۔" (۲۰)

مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر لکھتے ہیں:

"افسوس وہ پر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفرین سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہوجاتا تھا، اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ برّاں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پرزوردست و بازو جو شب وروز کی خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہوکر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، **الوداع! محمدعلی! الوداع! والسلامَ الیٰ یوم القیام۔**" (۲۱)

سید صاحب کی یہ غمناک تحریریں اور نثری مرثیے بعد ازاں "یادرفتگاں" کے نام سے مجلس نشریات اسلام، کراچی سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

"یادرفتگاں میں جن شخصیتوں کی وفات پر مجلس ماتم برپا کی گئی ہے ان کا دائرہ اعزہ واحباب، علماء وفضلاء، ادباء وشعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے۔ اس مجموعہ میں ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں یہودی بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں، انگریز بھی، مصری بھی ہیں اور ترکی بھی، اسی طرح ان میں جج بھی ہیں بیرسٹر بھی، ملا بھی ہیں اور مسٹر بھی، پیر بھی ہیں فقیر بھی، شاعر بھی ہیں خطیب بھی، سیاستداں بھی ہیں، گوشہ نشیں وگمنام بھی ہیں اور نامور مشاہیر بھی، غرض یہ کتاب رنگارنگ پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہے۔" (۲۲)

معارف کی بنیاد میں مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ جو دوسرا ہاتھ برابر کا شریک تھا وہ علامہ شبلی کے ایک اور عزیز شاگرد اوران کے طرز نگارش کے متبع مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۲ء۔۱۹۵۶ء) کا تھا، تاریخ، تذکرہ نگاری، ادب، تحقیق، تنقید اور شاعری میں مولانا ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات مثلاً مذاہب، قرآن و حدیث، فقہ، فلسفہ و کلام، تاریخ و تصوف، سیر و سوانح، تعلیم اور شعر و ادب پر خامہ فرسائی کی اور بے شمار تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ (۲۳) درجِ ذیل تین شخصیات پر تعزیتی مضامین سپردِ قلم کیے: نواب حاجی محمد اسحاق خان بہادر (نومبر ۱۹۱۸ء)، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (نومبر ۱۹۱۸ء)، مولانا عین القضاۃ (فروری ۱۹۲۵ء)۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے تعزیتی مضمون کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

''موجودہ زمانہ میں جبکہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے تصوف کی صورت بالکل مسخ ہو چکی ہے، اس سلسلے کے مشہور بزرگ مولانا عین القضاۃ صاحب کی وفات مسلمانوں کے لیے ایک سخت قومی مصیبت ہے۔

مولانائے مرحوم، مولانا عبدالحئی صاحب کے فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں تھے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد انھی کے زمانہ میں مصروف درس و تدریس ہو گئے تھے اس زمانہ میں انھوں نے درس نظامیہ کی مشہور و متداول کتاب ہبذی پر ایک نہایت مبسوط حاشیہ بھی لکھا تھا، جس میں مولانا عبدالحئی صاحب کے طرز تحریر کی وضاحت اور جامعیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے بعد حلقہ ارادت میں شامل ہو کر علم و عمل کا بہترین نمونہ بن گئے اور تمام عمر نہایت زہد و توکل کے ساتھ بسر کر دی۔

ان کی زندگی ہمارے فقراء و صوفیہ کے لئے اس حیثیت سے نہایت سبق آموز ہے کہ انھوں نے یہ زاہدانہ طرز معاشرت فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر نہیں اختیار کیا تھا، بلکہ کئی ہزار روپیہ ماہوار کے صرف سے ایک عظیم لشان مدرسہ قرآنیہ جاری کر رکھا تھا، اور اس کے مصارف وہ خود اپنی جیب خاص سے بالکل نامعلوم طریقہ پر ادا فرماتے تھے، اس کے علاوہ سال میں ایک بار تمام شہر کو عام دعوت دیتے تھے، جس کا سلسلہ صبح سے شام تک قائم رہتا تھا۔'' (۲۴)

سید سلیمان ندوی کے ترکِ وطن کے بعد جب دارالمصنفین کے پرانے نظام میں تبدیلی ہوئی تو سید سلیمان ندوی کے شاگرد شاہ معین الدین ندوی (م ۱۹۷۴ء) کو شعبہ علمی کی نظامت سپرد کی گئی۔ شاہ معین الدین ندوی، سید سلیمان ندوی کے شاگرد، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق فرزند، دارالمصنفین کے ناظم، معارف کے مدیر اور تاریخ اسلام کے بلند پایہ مورخ تھے۔ تاحیات تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ تقریباً ۳۰ برس معارف کے شذرات لکھے اور مختلف موضوعات پر ایک درجن کتابیں لکھ کر علم و فن کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ حکومت ہند نے ان کی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔ (۲۵) شاہ صاحب نے ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو دارالمصنفین ہی میں وفات پائی اور اپنے وطن رودولی ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) میں سپرد خاک ہوئے۔

سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی کے نام مارچ ۱۹۵۱ء کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''آپ کے ہونے کو میں

اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں، اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسے ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، آپ جہاں تک ہو سکے دین کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں، اور ساتھ اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمدللہ آپ نے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا اور ''س'' اور ''م'' میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو۔ الحمدللہ''۔(۲۶)

شاہ معین الدین ندوی نے سو سے زائد وفیات تحریر کیں۔ شاہ صاحب کے تعزیتی مضامین میں سید سلیمان ندوی کے طرزِ تحریر کی جھلک نمایاں تھی اور واقعتاً ''س'' (سلیمان ندوی) اور ''م'' (معین الدین ندوی) میں امتیاز مشکل تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال پر شاہ معین الدین ندوی یوں رقمطراز ہیں:

''بالآخر اس مسیحا نفس نے بھی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی جو نصف صدی تک اپنے انفاس کرم سے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکتا رہا، وہ روشن ضمیر اٹھ گیا جو اپنے نور بصیرت سے تاریک دماغوں کو منور کرتا رہا، کاروان ملت کا وہ حدی خواں رخصت ہو گیا جو اپنی ہدایت و رہنمائی سے گم کردہ راہوں کو راہ راست دکھلاتا رہا، وہ شمع فروزاں خاموش ہو گئی جس کی روشنی سے علم معرفت کا ہر گوشہ منور تھا، ابوالکلام کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا حادثہ ہے اور اس حادثہ پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ''(۲۷)

مولانا شاہ معین الدین ندوی کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۷۵ء میں مولانا عبدالسلام قدوائی (۱۹۰۷ء-۱۹۷۹ء) دارالمصنفین کے شریک ناظم اور ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن بنائے گئے۔ ایک درجن سے زائد کتب اور متعدد مقالات کے مصنف ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''ہندوستان کی کہانی'' اور ''ہماری بادشاہی'' دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں سے ہیں۔ ۲۴/اگست ۱۹۷۹ء میں اپنے وطن تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ (۲۸) درج ذیل انیس شخصیات پر تعزیتی مضامین قلمبند کیے:

مولانا ابوالوفاء افغانی (ستمبر ۱۹۷۵ء)، مولانا محمد شاہد فاخری (اکتوبر ۱۹۷۵ء)، مولانا محمد میاں (نومبر ۱۹۷۵ء)، شورش کاشمیری (نومبر ۱۹۷۵ء)، پروفیسر سید مسعود حسن (دسمبر ۱۹۷۵ء)، میاں مہر محمد خاں شہاب (اپریل ۱۹۷۶ء)، شاہ فخر عالم بھاگلپوری (جون ۱۹۷۶ء)، جناب محمد یوسف صاحب صدیقی (جون ۱۹۷۶ء)، مولانا حافظ عبدالعزیز (جون ۱۹۷۶ء)، مولانا محمد عثمان فارقلیط (جولائی ۱۹۷۶ء)، مولانا محمد اویس ندوی نگرامی (ستمبر ۱۹۷۶ء)، شاہ عزالدین پھلواروی ندوی (جون ۱۹۷۷ء)، مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی (جون ۱۹۷۷ء)، مولانا محمد سلیم کیرانوی مرحوم (ستمبر ۱۹۷۷ء)، مولوی عبدالحمید ندوی (ستمبر ۱۹۷۸ء)، ڈاکٹر سید عابد حسین (جنوری ۱۹۷۹ء)، مولانا فضل اللہ مرحوم (جون ۱۹۷۹ء)، مولوی محمد الحسنی (جولائی ۱۹۷۹ء)، محمد اسحٰق جلیس

مرحوم (جولائی ۱۹۷۹ء)۔

مولانا محمد میاں پر عبدالسلام قدوائی ندوی کا تعزیتی نوٹ ملاحظہ کیجیے:

''مولانا محمد میاں سے قارئین معارف بخوبی واقف ہیں، ان کی علمی و عملی خدمات محتاج تعارف نہیں، وہ در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق کے قائل تھے، انھوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کو اپنی زندگی میں سمو رکھا تھا، مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے لئے سکون قلب اور فراغ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن محمد میاں نے سیاست کے پرشور ہنگاموں اور قید و بند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے، انھوں نے نہ کبھی دار و رسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یا درس و تدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول، جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے، اور اس راہ کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے، وہ زندگی بھر اس روش پر چلتے رہے، سیاست کے ساتھ تقویٰ پر عمل بہت مشکل ہے، مگر انھوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا، ان کی خدمت بے لوث اور ان کی سیرت بے داغ تھی، جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہے، ہر شخص سیادت کا طالب ہوتا ہے لیکن ان کا ذہن اس عیب سے پاک تھا، انھوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا اور اس راہ ایثار میں ہر پریشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، افسوس ہے کہ علم و عمل اور ایثار و خدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے، اور دوسروں کو ان کی پاکیزہ اور پرخلوص زندگی کو نمونہ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔'' (۲۹)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے انتقال کے بعد ستمبر ۱۹۷۹ء سے معارف کی ادارت کی ذمہ داری تنہا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے کاندھوں پر آگئی۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، دبستان شبلی کے نامور اہل قلم اور بلند پایہ محقق و مصنف تھے۔ ۱۹۱۱ء میں صوبہ بہار کی مردم خیز بستی دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے انگریزی تعلیم کا رواج تھا اس لیے انھوں نے بھی انگریزی تعلیم شروع کی اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج سے بھی ڈگری لی اور جامعہ ملیہ میں بھی کچھ مدت گذاری، پھر مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی اور ۱۹۳۵ء میں وہ دارالمصنفین آگئے، یہاں تصنیف و تالیف کے کام سے ایسی دلچسپی و مناسبت پیدا ہوئی کہ مرنے کے بعد ہی اس سے تعلق منقطع ہوا۔ (۳۰)

صباح الدین عبدالرحمٰن کو تاریخ ہند میں اختصاص حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب و انشاء پرداز سے زیادہ مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ پچاس سے زیادہ علمی، ادبی اور تاریخی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں کثرت سے مضامین و مقالات سپرد قلم کیے۔ ۱۸/ نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں ایک سڑک حادثہ میں وفات پائی اور دارالمصنفین میں علامہ شبلی کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔ (۳۱)

اپنے احباب، معاصر اور مشاہیر و فضلاء کی رحلت پر جو غم ناک اور اثر انگیز مضامین لکھے وہ سب ان کے مخصوص اور

دلچسپ طرزِ تحریر کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے اور بعد ازاں دو جلدوں میں ''بزم رفتگاں'' کے نام سے کتابی صورت میں (مکتبہ جامعہ، دہلی سے) شائع ہوئے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ساٹھ سے زائد شخصیات کی وفیات قلمبند کیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''رشید احمد صدیقی کے انتقال پر ان کے اسلوب نگارش کو معارف کے صفحات میں یوں خراجِ تحسین پیش کیا گیا:

''ان کی علمی وادبی تحریروں میں بڑی آب وتاب ہوتی، ان کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی طرح اردو زبان کا ایک علی گڑھ اسکول بھی بن گیا ہے، وہ جب کوئی تحریر لکھتے اس میں اردو کے ساتھ علی گڑھ یا علی گڑھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور در لے آتے، ان کو خود اعتراف ہے کہ ان میں انداز گل افشانی گفتار علی گڑھ ہی کے پیمانہ وصہبا سے آیا، ان کی تحریروں میں مشرقیت کے احترام کے ساتھ مغربیت کا پاس خاطر بھی ہوتا، جن میں خوش طبعی، شائستگی اور خیر اندیشی کے آبدار موتی بھی جھلملاتے رہتے، اپنے محبوب معاصروں اور خصوصاً علی گڑھ کے کسی نامور فرزند کی وفات پر کوئی ماتمی تحریر لکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ اس کی تربت پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں، مولانا محمد علی پر ان کا نوحہ ان کے قلم اور خود اردو ادب کی انشا پردازی کی بہترین مثال ہے۔ وہ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ بوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے،......محمد علی کو بدتوفیقوں اور بدمذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بدتوفیق اور بدمذاق بھوکے تھے، بوالہوس اور کثیر کینہ پرور بھی، محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے......''ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید تلاش ہو'' آج کون ہے جو ایسے ڈھلے، ترشے اور کندن کی طرح چمکتے ہوئے جملے لکھ سکتا ہے، ان کی گنج ہائے گرانمایہ اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بنی رہے گی۔'' (۳۲)

ڈاکٹر یوسف حسین کے انتقال پر اہل علم کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقہ میں بڑا ماتم ہوگا آج کل خاص خاص حلقے ایسے بنے ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کے بجائے صرف ایک دو سال رو کر اپنے چمن کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے، ایسے حلقہ کی نرگس اپنی بے نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین کی دیدہ وری کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکی، اس لیے ان کا یہاں ماتم نہ ہوا تو تعجب کرنے کی بات نہیں، مگر جو اپنی نظروں میں نور رکھتے ہیں، وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علم کی بصارت، بصیرت، ان کی رائے کی اصابت، پھر ان کی ادبی ذوق کی پاکیزگی، قلم کی رعنائی، تنقید نگاری کی دل آویزی اور گہرائی کو یاد کریں گے، اور اکثر یاد کر کے اپنے ذوق ادب اور علم وتحقیق میں نفاست، نظافت اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب اب آپ وہاں ہیں جہاں اسلامی درد، مذہبی اضطراب، اور ملی غیرت وحمیت کی بڑی قدر ہوتی ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان محاسن کا بہت بڑا حصہ عطا کیا تھا، اس لیے شفیع المذنبین ﷺ کے صدقے میں آپ رب

العالمین کی رحمتوں اور برکتوں سے ضرور سرفراز کیے جائیں گے، آمین ثم آمین۔'' (۳۳)

شاہ معین الدین ندوی کے انتقال پر یہ الفاظِ رخصت دیکھیے:

''الوداع اے شبلی کے علمی لشکر کے آخری رجز خواں! الوداع اے سلیمان کے کارناموں کے حدی خواں! الوداع اے جانِ جانانِ دارالمصنفین! سلام! شبلی کی روح کی طرف سے سلام! سلیمان کی سندِ علم کی طرف سے سلام! کارکنانِ دارالمصنفین کی طرف سے سلام! اور ہاں ایک مہجور مغموم، محزوں، خستہ دل اور شکستہ خاطر رفیق کار کی طرف سے بھی سلام! ہزاروں سلام، لاکھوں سلام۔'' (۳۴)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال (۱۹۸۷ء) کے بعد سرائمیر کے مدرسۃ الاصلاح کے نامور فرزند اور مولانا شاہ معین الدین ندوی کے خصوصی تربیت یافتہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی دارالمصنفین کے ناظم مقرر ہوئے۔ مولانا کا وطن اعظم گڑھ شہر سے قریب ایک گاؤں سہریا ہے، ۱۹۳۷ء میں وہ اپنے ننہالی گاؤں جے راج پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ عبدالرحمان ایک چھوٹے زمیں دار اور صاحبِ علم شخص تھے، اردو اور فارسی ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، دس سال کی عمر میں مولانا مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے، اس وقت مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا جلیل احسن اصلاحی جیسے علماء کی موجودگی نے مدرسۃ الاصلاح کو خاص مرجعیت بخشی تھی، ان اربابِ کمال سے تلمذ و استفادے کے بعد قریب بیس سال کی عمر میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے۔ مولانا کا سب سے پہلا مضمون فروری ۱۹۵۵ء کے معارف میں چھپا ''امام اعظم کی فقہ'' (ترکِ حدیث کے جواب میں) کے عنوان سے، اس اولین مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین آنے سے پہلے ہی وہ معارف کے ذریعہ متعارف ہو چکے تھے، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں بھی ان کے چند مضامین چھپے اور یہ سب قرآنی موضوعات پر تھے، مارچ ۱۹۵۸ء سے مطبوعات جدیدہ کے تحت کتابوں پر ان کی تبصرہ نگاری کا آغاز ہوا۔ (۳۵)

مولانا کی ان تصنیفات کے علاوہ ان کی علمی خدمات کا اصل میدان رسالہ ''معارف'' رہا، ۱۹۵۵ء سے اس کے صفحات ان کی تحریروں سے مزین ہونا شروع ہوئے اور یہ نصف صدی پر محیط ہو گئے، مطبوعات جدیدہ کے ذریعہ انہوں نے بے شمار کتابوں پر تبصرہ کیا، ان کے تعزیتی مضامین بھی آتے رہے اور جب ۱۹۸۷ء میں سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ایک حادثے میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو معارف کی ادارت ان کے سپرد ہوئی اور یہ ان کی کتابِ زندگی کا سب سے درخشاں باب ہے کہ انہوں نے معارف کی ادارت اور شذرات لکھنے کی ذمہ داری غیر معمولی حسن و خوبی سے پوری کی اور معارف کے وقار و معیار کو قائم رکھا بلکہ اس میں اضافہ کیا۔ (۳۶) علاوہ ازیں سینکڑوں علمی مقالات اور کئی کتب تصنیف کیں۔ معارف کی ادارت کے ساتھ انہوں نے دارالمصنفین کے عہدۂ نظامت کا بار بھی سنبھالا، وہ ۱۹۸۷ء سے تادمِ آخر اس عہدے پر فائز رہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے کم و بیش دو سو شخصیات کی وفیات قلمبند کیں۔

مولانا اصلاحی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وفات پر لکھتے ہیں:

''افسوس صد افسوس کہ وہ فرزند اسلام نہیں رہا، جس کی اذانِ توحید سے مغرب کی وادیاں گونج رہی تھیں اور ہزاروں نفوس ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، وہ سرچشمہ ہدایت بند ہوگیا جس سے مریضانِ کفر و ضلالت شفایاب ہو رہے تھے، واحسرتا کہ دین و دانش کا وہ آفتاب غروب ہوگیا جس سے مشرق و مغرب دونوں ضیا بار تھے اور تاریکیوں میں بھٹکنے والے راہ یاب ہو رہے تھے، علم کا وہ بے کراں سمندر راکد ہوگیا جس سے اسلام کا درخت سرسبز و شاداب تھا، دریائے تحقیق کا وہ شناور اور غواص چلا گیا جو یورپ کے کتب خانوں میں اپنے آبا کی موجود کتابوں سے علم کے جواہر نکالتا تھا، وہ پیکرِ علم و فن روپوش ہوگیا جو ابر نیساں بن کر پون صدی سے موتی لٹا رہا تھا، حکمت و معرفت کا وہ مجمع البحرین دنیا سے رخصت ہوگیا جو مشرق کے علمی میخانوں سے بھی سرشار تھا اور مغرب کے میکدہ حکمت سے بھی مخمور تھا، وہ ہستی نہیں رہی جس کے فیض و کمال کا سکہ بلادِ مشرق اور عالمِ اسلام ہی میں نہیں، یورپ و امریکہ میں بھی چل رہا تھا، حیف صد حیف اس ذات گرامی کا خاتمہ ہوگیا جس کا دماغ نادر معلومات کا خزینہ اور سینہ علومِ نبوی کا سفینہ تھا، جس کا قلم دشمنانِ اسلام کی علمی خیانتوں اور عیاریوں کو بے نقاب کرتا تھا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت و صداقت کو آشکار کرتا تھا، آہ ثم آہ کہ وہ سراپا علم و تحقیق روپوش ہوگیا جو تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے اولین مصادر اور مسلمانوں کے نایاب اور گم شدہ علمی اندوختوں کو ڈھونڈ نکالتا تھا، وہ وجودِ مقدس خاموش ہوگیا جس نے پیرس میں بھی آداب سحر خیزی نہیں چھوڑے، جس کے راسخ العقیدگی کو مغرب کے فسق و فجور نے اور پختہ کر دیا تھا اور فحاشی و معصیت کی طغیانی نے اس کے ایمان و یقین میں مزید اضافہ کر دیا تھا، وادریغا کہ وہ کامل الایمان اور راسخ العقیدہ غایب ہوگیا جس کے پائے استقامت و عزیمت کو کفر و الحاد کی بادِ صرصر کبھی متزلزل نہیں کر سکی، جس کی متاع دین و تقویٰ کو حسن و عشرت کی جلوہ گاہیں غارت نہ کر سکیں اور جس کے دامن عفت و طہارت پر دنیا کی رعنائیاں اور دل فریبیاں کوئی داغ و دھبا نہ ڈال سکیں یعنی شہرہ آفاق عالم و محقق، نامور مصنف و فاضل، اسلام کے جاں نثار و فدائی اور اس کے مخلص داعی و مبلغ، نکتہ داں سیرت نگار، دیدہ ور مورخ، اسلامی فقہ و قانون کے ماہر، علوم دینیہ میں یگانہ اور جدید علوم میں فخر روزگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۹۴ برس کی عمر میں ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، جن کی پاکیزہ زندگی اور مطہر شخصیت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھی اور جو اس عہد کے ابن سعد و طبری، بلاذری و یعقوبی، ابن اسحاق و ابن ہشام، ابن اثیر و ابوالفدا اور شمس الائمہ سرخسی اور علامہ ابن عابدین تھے، ان کی موت سے عالم اسلام ویران ہوگیا، دنیائے علم میں خاک اڑنے لگی، اہل علم، اصحاب نظر اور محققین، سراپا درد و حسرت بنے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں:

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام تو چیزے دیگرے'' (۴۷)

اور صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال پر الوداع کے یہ الفاظ دیکھیے:

''اے کاروانِ شبلی کے مسافر الوداع! اے مملکت سلیمان کے تاجدار الفراق!!'' (۳۸)

یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا اصلاحی نے دیگر مدیرانِ جرائد کی طرح معارف کو اپنی ذاتی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا نہ ہی حدیث ذات کو حدیث جہاں بنا کر پیش کیا۔ دوسروں پر طول طویل تعزیتی تحریریں لکھنے والے نے اپنے والد کی وفات والد محترم کا انتقال چند سطور میں اس طرح کیا:

''شذرات لکھے جا چکے تھے کہ راقم کے والد حاجی عبدالرحمٰن صاحب وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۱/ نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔ قارئین معارف سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔'' (۳۹)

معارف کے موجودہ مدیر حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی (پ: ۱۹۵۳ء) اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ دریاباد میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں عربی و اسلامیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء گئے جہاں سے ۱۹۷۵ء میں امتیاز کے ساتھ فراغت حاصل کی۔ دوران تعلیم ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ تعمیر حیات کے شاہ معین الدین ندوی نمبر کے لیے شاہ صاحب کے شذرات معارف پر ایک عمدہ مقالہ سپرد قلم کیا جسے بے حد پسند کیا گیا اور اسی مقالے کی وجہ سے دارالمصنّفین کے اس وقت کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان کی مخفی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے فراغت کے فوراً بعد دارالمصنّفین بلالیا۔ (۴۰) عمیر الصدیق صاحب نے متعدد علمی و تحقیقی مقالات معارف میں لکھ کر داد و تحسین حاصل کی۔ مطبوعات جدیدہ پر تبصرہ اور اخبار علمیہ کا کالم پابندی سے لکھتے رہے ہیں۔ وفیات بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں اور اب (مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے انتقال کے بعد) معارف کے شذرات بھی آپ کے قلم سے نکل رہے ہیں۔ آپ اب تک ساٹھ سے زائد شخصیات پر تعزیتی مضامین تحریر کر چکے ہیں۔

مولانا ابوالعرفان خاں کے بارے میں اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

''نجی زندگی میں مرد قلندر کی طرح سادہ و آزاد تھے، ان میں علم کے پندار و تفوق کا کوئی شائبہ نہ تھا، ان کی سادگی دیکھ کر یقین نہ آتا کہ اس پر سکون سمندر کی تہہ میں علم کے بیش قیمت موتی بھی موجود ہوں گے، وہ بارعب اور وجیہہ تھے مگر اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کے سامنے بھی شاخ ثمر بار کی مانند خم ہو جاتے، چہرہ متبسم رہتا، ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی، باتوں سے گلوں کی خوشبو آتی، عمدہ کھانوں کے شوقین تھے، لیکن اس سے زیادہ کھلانے کا شوق تھا۔'' (۴۱)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے انتقال پر ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اعزازات اور بلند عہدوں کے باوجود فروتنی، انکسار اور تواضع کی مثال تھے، ان کی شخصیت سادگی اور بے ساختگی، دل نوازی اور ملن ساری کے عناصر سے مرکب تھی، اپنوں اور بیگانوں سے وضع داری تھی، بیس سال ناظم رہنے کے باوجود دارالمصنّفین کے کسی کارکن اور ملازم کو ان کی زبان سے کسی سخت کلام یا انداز کی شکایت نہیں ہوئی،

معمولی ملازم سے بھی بہت نرمی سے بات کرتے، صبر وتحمل کی خوبی ان کی بڑی صفت تھی، ان خوبیوں نے ان کی شخصیت کو ایک عجب کشش اور محبوبیت عطا کردی تھی، ذاتی زندگی میں انہوں نے کئی بڑے صدموں کو جس صبر ورضا سے برداشت کیا وہ ان کے راضی بہ رضا ہونے کی شہادت ہے، صوم وصلاۃ کے پابند تھے، خاص طور پر تلاوت قرآن پاک میں ہم نے ان کو سب سے زیادہ مشغول پایا، سفر حج کی سعادت پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی لیکن اس سال انہوں نے اپنی استطاعت سے اہلیہ محترمہ کے ساتھ حج کیا، تین جنوری کو وہ اس مبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یکم جنوری کو جس کے گھر کی مہمانی سے سرفراز ہوئے تھے اسی کے حضور اس طرح حاضر ہوئے کہ سرخ رو ہی نہیں سارا جسم شہید راہ وفا کی طرح لہولہان تھا، زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ،

بڑی آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے ''(۴۲)

ڈاکٹر شانتی سروپ کے انتقال پر یوں رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر شانتی سروپ بڑی خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، شخصیت پر نام اگر اثر انداز ہوتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا ایک سچا نمونہ تھے، سکوت وسکون کا پیکر، ہمیشہ ریشم وشبنم کی طرح بزم اور صہبا ونسیم کی مانند خراماں۔''(۴۳)

سوانح نگاری کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ کہ صاحب سوانح کے جملہ محاسن وعن حوالہ قلم کیے جائیں، دوسرے یہ کہ اس کے محاسن کے ساتھ اس کے معائب بھی بیان کیے جائیں، ان دو چیزوں کے علاوہ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں، سنہ اور جائے ولادت اور وہاں کے ماحول کا اجمالی تذکرہ بھی کیا جائے۔(۴۴) معارف کے اکثر تذکرے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

اسی طرح ہر شخص کی زندگی میں اہم واقعات کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر انسان میں جہاں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں وہاں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کسی کی صرف خوبیاں بیان کر کے اس کی مکمل تصویر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اہم واقعات کے علاوہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔(۴۵) ظفر احمد صدیقی کے انتقال پر معارف کا یہ نوٹ دیکھیے:

''جناب ظفر احمد صدیقی صاحب آج کل کی اصطلاح کے لحاظ سے تو بہت بڑے آدمی نہیں ہو سکے لیکن ان میں جو بے نفسی، بے غرضی اور ایثار پسندی تھی، اس لحاظ سے ان کی شخصیت میں بڑے پن کے پورے اوصاف تھے، مسلم یونیورسٹی کا ایسا جانثار مرد مجاہد مشکل سے کوئی ملے گا، جس لگن اور ایثار کے ساتھ انھوں نے اس یونیورسٹی کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے، مگر دکھ کی بات ہے کہ اس یونیورسٹی کے لوگوں نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ واقعی مستحق تھے، ان کی علالت کے زمانہ میں راقم کو جناب محترم نواب عبیدالرحمٰن خان شیروانی کی معیت میں ان کی عیادت کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا، دینی تعلیمی کونسل کے دفتر کے ایک معمولی کمرہ میں ان کو جس طرح پایا اس کو دیکھ کر انتہائی

تکلیف ہوئی، بجلی کا بہت ہی معمولی پنکھا ان کے سامنے ہوتا، ان کی راحت کا سامان اس سے بھی زیادہ معمولی تھا، خیال آیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اس مرد مجاہد کے لئے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی ہر چیز ان پر نچھاور کر دینا چاہئے تھی مگر یہ لوگ لکھنؤ آتے تو شاید ان کی عیادت کی بھی تکلیف گوارا نہ کرتے، اس کا بھی احساس ہے کہ اگر علی گڑھ کے لوگ ان کی مالی امداد کرنا بھی چاہتے تو وہ اپنی خودداری اور عزت نفس میں اس کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے، مگر علی گڑھ کے طلبہ و اساتذہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں کہ اپنے اس جان نثار مجاہد کے لئے ان کو کیا کرنا چاہئے تھا، اور کیا نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد، ان کی خدمات کا صلہ شاید یہی ملا ہوگا کہ وہاں کے ڈرائنگ روموں کے صوفوں پر اور دوسری تفریحی باتوں کے سلسلہ میں چند لمحوں کے لئے ان کا بھی ذکر آ گیا ہوگا، اس سے ہم کو اپنی ملت کی نفسیات کا اندازہ کرنا چاہئے، ہم میں آج کل اچھی قیادت نہیں ابھر رہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کی وہ قدر نہیں کرتے جس کے وہ واقعی مستحق ہوتے ہیں۔" (۴۶)

اسی طرح عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کے بارے میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی درجِ ذیل تحریر بھی ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے:

"نہایت وجیہہ و شکیل، شائستہ اور باوقار شخص تھے، چہرہ بڑا پُر نور تھا، اس سے متانت، سنجیدگی، طہارت، پاکیزگی اور معصومیت بھی ظاہر ہوتی تھی، سادہ لوحی اور معصومیت کی بنا پر بعض معاملات کی گہرائی تک نظر نہ جاتی، اور خودغرض قسم کے لوگ اس سے اپنا مطلب حاصل کر لیتے۔ کسی قدر جذباتی بھی تھے، اور چونکہ لاگ لپیٹ اور رورعایت کے عادی نہ تھے، اس لیے وقتی طور پر طبیعت میں اشتعال بھی پیدا ہو جاتا مگر نہ اس کا اثر دیرپا ہوتا، اور نہ کسی سے کینہ د کدورت رکھتے۔" (۴۷)

مدیران معارف کے علاوہ معارف میں وفیات پر دیگر اہلِ قلم کے مضامین بھی شائع ہوئے جن میں عبدالماجد دریابادی، ریاست علی ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، محمد نعیم صدیقی ندوی، پروفیسر مسعود حسن، سید شہاب الدین دسنوی، شیخ نذیر حسین، محمود الرحمٰن، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، شمس بدایونی، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر عبدالمغنی، پروفیسر مختار الدین احمد، مولانا افتخار فریدی، شیخ نذیر حسین، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا مستقیم احسن اعظمی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، رفیق احمد انصاری، عبداللطیف اعظمی، حافظ نثار احمد الحسینی، پروفیسر اصغر عباسی، ڈاکٹر جاوید علی خاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، عارف عمری، پروفیسر سید عبدالرحیم، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، رفیق احمد خان، عتیق احمد جیلانی، فیروز الدین احمد فریدی، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر محمود الحسن عارف اور اشتیاق احمد ظلی شامل ہیں۔

وفیات پر بعض تعزیتی تحریریں تو تحقیقی مقالات کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے کہ: احقر بہاری مرحوم (نومبر ۱۹۳۴ء)، مولانا محمد سجاد کی یاد (دسمبر ۱۹۴۰ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (اگست ۱۹۴۳ء)، ضیاء الحسن علوی مرحوم (جولائی ۱۹۴۵ء)، نواب فصاحت جنگ جلیل (مارچ ۱۹۴۶ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (اپریل ۱۹۵۰ء)، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی (دسمبر ۱۹۵۰ء)، حسرت موہانی (دسمبر

۱۹۵۱ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (دسمبر ۱۹۵۸ء)، ڈاکٹر عبدالحق (جولائی ۱۹۵۸ء)، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (مئی ۱۹۷۶ء)، ماہر القادری (جون ۱۹۷۸ء)، مولانا عبدالعزیز میمنی (دسمبر ۱۹۷۸ء)، ڈاکٹر سید عابد حسین (جنوری ۱۹۷۹ء)، ڈاکٹر محمد ایوب قادری (نومبر ۱۹۸۴ء)، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (جولائی ۱۹۸۵ء)، پروفیسر مسعود حسن (ستمبر ۱۹۹۲ء)، ڈاکٹر معظم حسین (نومبر ۱۹۹۲ء)، مالک رام (مئی۔ جون ۱۹۹۳ء)، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (۱۹۹۶ء)، مولانا محمد منظور نعمانی (۱۹۹۷ء)، قاضی محمد زاہد الحسینی (جولائی ۱۹۹۷ء)، مولانا امین احسن اصلاحی (جنوری ۱۹۹۸ء)، حکیم عبدالحمید (اگست ۱۹۹۹ء)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (اگست ۲۰۰۰ء)، ڈاکٹر خورشید احمد فارق (جنوری ۲۰۰۲ء)، پروفیسر آل احمد سرور (اپریل ۲۰۰۲ء)، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی (جون ۲۰۰۲ء)، علی جواد زیدی (فروری ۲۰۰۵ء)، ڈاکٹر شوقی ضیف (مئی ۲۰۰۵ء)، نجیب محفوظ (نومبر ۲۰۰۶ء)، شیخ نذیر حسین (نومبر ۲۰۰۷ء)۔ جبکہ ڈاکٹر ذاکر حسین (جون۔ جولائی ۱۹۶۹ء) اور ڈاکٹر سید محمود (نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۱ء) پر صباح الدین عبدالرحمٰن کے مضامین ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وفیات معارف میں سرخیوں کی رعایتِ لفظی پراثر، پرورد اور فصاحت و بلاغت کا شہکار ہے۔ جیسے غمِ اکبر (اکبرالٰہ آبادی)، ہماری جماعت کا لعلِ شب چراغ گم ہو گیا (عبدالرحمٰن نگرامی ندوی)، خادمہ ملت و مخدومہ امت کا ماتم (والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم)، الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن (مولانا حمید الدین فراہی)، ماتم یہ زمانہ میں بپا "تیرے" لیے ہے (مولانا محمد علی جوہر)، ماتمِ اقبال (علامہ محمد اقبال)، ماتم گسارِ برامکہ کا ماتم (مولوی عبدالرزاق کانپوری)، واحسرتا (حسرت موہانی)، علم و اخلاق کی دنیا اجڑ گئی (سید سلیمان ندوی)، وحشت کی رحلت، ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہو گیا (پنڈت جواہر لال نہرو)، کاروانِ شبلی کا آخری مسافر (مسعود علی ندوی)، مسندِ شبلی و سلیمان اجڑ گئی (سید صباح الدین عبدالرحمٰن)، فراقِ مجذوب (خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؔ)، قافلہ کا آخری مسافر (نواب وقار الملک)، یادِ خلیل (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)، آہ! بدرِ کامل غروب ہو گیا (مولانا بدر الدین اصلاحی)، ملک و ملت کا مسیحا نہیں رہا (حکیم عبدالحمید)، داعی الی اللہ کی وفات (مولانا ابوالحسن علی ندوی)، اردو کا سردار چلا گیا (سید علی سردار جعفری)، مر گیا غالبِ آشفتہ نوا۔ ...(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تھی (رشید حسن خان)۔

مجموعی طور پر ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں گزشتہ چھیانوے سال (۱۹۱۶ء تا ۲۰۱۲ء) میں سات سو تراسی (۷۸۳) شخصیات کی وفیات قلمبند کی گئی ہیں۔ یہ تذکرہ رفتگاں جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اعزہ و احباب، علماء وفضلاء، ادباء و شعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے۔ ان شخصیات میں ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں یہودی بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں، انگریز بھی، مصری بھی ہیں اور ترکی بھی، امریکی بھی ہیں اور جرمن بھی، اسی طرح ان میں جج بھی ہیں بیرسٹر بھی، ملا بھی ہیں اور مسٹر بھی، سائنسدان بھی ہیں ماہر نفسیات بھی، ماہر جنسیات بھی ہیں صوفی باصفا بھی، پیر بھی ہیں فقیر بھی، شاعر بھی ہیں خطیب بھی، سیاستداں

بھی ہیں، گوشہ نشیں و گمنام بھی ہیں اور نامور مشاہیر بھی، غرض یہ کہ کون ہے جس کا تذکرہ نہیں ہے۔ بجا طور پر معارف کے یہ صفحات گذشتہ صدی کی ملی و قومی، علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی تاریخ کے ایک ماخذ اور وفیات کے انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتے ہیں۔

❁❁❁

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی، اسلامی ادب میں وفیات نویسی کی روایت، مشمولہ: مجلّہ اسلامی تاریخ و ثقافت، نمبر ا۔۲۰۰۷ء، کراچی: شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، ص ۵۰۔۵۱

۲۔ مالک رام، تذکرہ معاصرین، مقدمہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل، ۲۰۱۰ء، راولپنڈی، ص ۳۳

۳۔ ایضاً، ص ۳۵ ۴۔ اسلامی ادب میں وفیات نویسی کی روایت، ص ۶۰

۵۔ مقدمہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولا بالا، ص ۳۳

۶۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۱۲ء، ص ۳

۷۔ ایضاً، جولائی ۱۹۱۶ء، ص ۲

۸۔ ابوسفیان اصلاحی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مجلہ' الاصلاح. ایک تعارف' کا جائزہ، مشمولہ: الایام، کراچی، دسمبر ۲۰۱۲ء، جلد ۳، شمارہ ۲، ص ۵۱

۹۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، سوانح حیات، مشمولہ: ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر)، مطبع معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۱۱

۱۰۔ الیاس اعظمی، محمد، ڈاکٹر، دار المصنفین کی تاریخی خدمات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۹

۱۱۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۵۴ء، ص ۸۲

۱۲۔ الیاس اعظمی، محمد، ڈاکٹر، دار المصنفین کی تاریخی خدمات، ص ۱۷۹

۱۳۔ معین الدین ندوی، شاہ، حضرت الاستاذؒ کے دینی و علمی خدمات، مشمولہ: ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر)، ص ۲۱۰

۱۴۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۱۶ء، ص ۱۲

۱۵۔ ایضاً، فروری ۱۹۲۳ء، ص ۸۲ ۱۶۔ ایضاً، جون ۱۹۴۳ء، ص ۴۰۳

۱۷۔ رشید احمد صدیقی، گنج ھائے گراں مایہ، مشمولہ: ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر)، ص ۱۲۵

۱۸۔ صباح الدین عبدالرحمٰن سوانح حیات، محولا بالا، ص ۳۹

۱۹۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۲ء ۲۰۔ ایضاً، نومبر ۱۹۳۰ء، ص ۳۲۲۔۳۲۳

۲۱۔ ایضاً، جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۲

۲۲۔ علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات،ص۱۹۸۔۱۹۹

۲۳۔ دار المصنفین کی تاریخی خدمات،ص۳۰۴

۲۴۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،فروری۱۹۲۵ء،ص۸۲

۲۵۔ دار المصنفین کی تاریخی خدمات،ص۲۴۷

۲۶۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،فروری۱۹۵۴ء،ص۸۴

۲۷۔ ایضاً،مارچ۱۹۵۸ء،ص۶۲

۲۸۔ دار المصنفین کی تاریخی خدمات،ص۳۴۵

۲۹۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،نومبر۱۹۷۵ء،ص۳۲۴

۳۰۔ ایضاً،دسمبر۱۹۸۷ء،ص۴۰۳

۳۱۔ دار المصنفین کی تاریخی خدمات،ص۲۷۲

۳۲۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،فروری۱۹۷۷ء،ص۸۳۔۸۴

۳۳۔ ایضاً،اپریل۱۹۷۹ء،ص۲۹۷۔۲۹۸

۳۴۔ ایضاً،جنوری۱۹۷۵ء،ص۱۰/۴

۳۵۔ ایضاً،مارچ۲۰۰۸ء،ص۱۶۳

۳۶۔ ایضاً،مارچ۲۰۰۸ء،ص۱/۱۶۴

۳۷۔ ایضاً،مارچ۲۰۰۳ء،ص۱۶۲۔۱۶۳

۳۸۔ ایضاً،دسمبر۱۹۸۷ء،ص۴۰۸

۳۹۔ ایضاً،نومبر۱۹۹۴ء،ص۳۲۴

۴۰۔ دار المصنفین کی تاریخی خدمات،ص۳۵۰

۴۱۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،دسمبر۱۹۸۸ء،ص۳۵۹

۴۲۔ ایضاً،مارچ۲۰۰۸ء،ص۳/۱۶۴

۴۳۔ ایضاً،اکتوبر۲۰۱۱ء،ص۳۱۳

۴۴۔ مولانا مظہر الاسلام قاسمی،سوانح نگاری کے اصول،مشمولہ:ماہنامہ معارف،جولائی۲۰۰۴ء،ص۴۱

۴۵۔ ماہر القادری،یاد رفتگاں (حصہ اول)،مرتبہ:طالب ہاشمی،حسنات اکیڈمی،لاہور،نومبر۸۶،ص۱۵

۴۶۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،نومبر۱۹۸۰ء،ص۳۷۷۔۳۷۸

۴۷۔ ایضاً،دسمبر۱۹۸۴ء،ص۴۶۴

❀ ❀ ❀